نیا گورنر ۶۵ھ کا رمضان ختم ہونے سے پانچ دن قبل کوفہ پہنچا[1]۔ اس کی ابتدائی تقریر سننے شیعے بھی آئے تقریر کے بعد مختار کے بعض سربرآوردہ شیعوں نے ابن المطیع کی تقریر کے ایسے حصوں پر جو ان کے نقطہ نظر سے مختلف تھے خوب نکتہ چینی کی بلکہ نہایت گستاخانہ طریقے پر آوازے کسے ابن مطیع ایک صلح جو آدمی تھا: اس کی بدقسمتی تھی کہ ایسے ماحول میں جہاں حجاج کا سا تشدد ضروری تھا اس کو حاکم بنا کر بھیجا گیا۔ اس نے سمجھا بجھا کر شیعوں کو مطمئن کردیا۔ وہ فاتحانہ شان سے لوٹ گئے اور نئے گورنر کی کمزوری سب پر عیاں کرنے لگے گورنر نے ایک لائق عرب کو شہر کا کوتوال مقرر کیا جو خوب چوکنا رہتا اور پولیس کے ساتھ شہر میں گشت لگاتا مختار حکومت کوفہ پر قبضہ کرنے کی جارحانہ تیاریاں کرنے لگا۔ یہ طے پایا کہ ۶۶ھ کے محرم میں یعنی نئے گورنر کی آمد کے چھ مہینے بعد بغاوت کی جائے موالی اور پامال جفا غلاموں کا وہ مربی اعظم بن گیا۔ اپنی چرب زبانی، حسن سلوک اور اہل بیت کی محبت کے دعووں سے اس نے ان کے دل موہ لئے۔ موالی میں بہت سے لوگ ساسانی کیوتری اور حاکم طبقہ کے تھے جو اساورہ اور مزارج کہلاتے تھے یہ لوگ ۱۲ھ سے ۱۹ھ تک کی فتوحات میں گرتے ہوئے ایرانی اقبال کی زد میں آکر مسلمان ہو گئے تھے اور ان قبیلوں سے خود کو ضم کرلیا تھا جو آنحضرت سے قریب تھے جن قبیلوں سے یہ منسلک ہوتے وہ جنگ کے موقع پر ان سے مدد لیتے تھے لیکن مال غنیمت سے اس بنا پر ان کو محروم رکھتے کہ یہ ان کے آزاد کردہ (موالی) تھے۔ حکومت کے محاصل میں بھی ان کا کوئی حصہ نہ تھا اس وجہ سے باہم قبائلی یا سیاسی جنگوں سے یہ گریز کرتے اور اگر مجبوراً لڑنے بھی تو دل سے اپنی شایان شان شجاعت کے ساتھ نہ لڑتے اور موقع پاکر بھاگ جاتے مختار پہلا شخص تھا جس نے اس امتیاز کو مٹایا، ان کو اپنا معتمد بنایا، مال غنیمت اور محاصل حکومت میں ان کو عربوں کے ساتھ مساویانہ حقوق دینے کا وعدہ کیا اور دوسری طرف اہل بیت کے حامی کی حیثیت سے ان کی روحانی وفاداری بھی حاصل کی۔ مصنف اخبار الطوال ص۲۹۷ لکھتا ہے: "مختار بن عبید (بعد رہائی)، شیعوں سے ملتا پھرتا اور وہ اس کے پاس آتے جاتے رہتے، وہ ان کو اپنے

[1] طبری ۹۵/۷

ساتھ بغاوت کرنے اور حسینؓ کا انتقام لینے کے لئے اکساتا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی دعوت مان لی ان میں اکثریت قبیلۂ ہمدان (جس سے حجر بن عدی کا تعلق تھا) اور ابنائے عجم (فارسی نسل) کی تھی جو کوفہ میں آباد تھی جن کو معاویہ نے باقاعدہ افواج میں داخل کر لیا تھا ان کو حمراء (سرخ رنگ) کہا جاتا تھا۔ ان کے تقریباً بیس ہزار جوالمرد کوفہ میں آباد تھے۔"

مختار کے لئے ایک تیسرا خطرناک لمحہ پھر آیا۔ اس کی سرگرمیاں باوجود محتاط ہونے کے نہ چھپ سکیں۔ کوتوال نے کئی بار اس کی مسلح تیاریوں کی گورنر سے شکایت کی۔ گورنر یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ جب تک بغاوت کھل نہ جائے میں محض شک پر کوئی تعزیری کارروائی نہیں کروں گا حکومت کے وفادار قبائلی مکھیوں نے حالات کی ابتری کا اس کو احساس دلاتے ہوئے مختار کو قید کرنے کا مشورہ دیا گورنر نے مختار کے چچا زاد بھائی زائدہ بن قدامہ کی معرفت اس کو بلایا (قید کرنے کے ارادہ سے) زائدہ کو گورنر کا ارادہ معلوم تھا وہ گیا اور مختار کو پیغام دیا۔ مختار اٹھ کر تیاری کرنے لگا کہ اتنے میں زائدہ نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس سے مختار خطرہ تاڑ گیا اور کپڑے اتار کر بیماروں کی شکل بنا کر چارپائی پر لیٹ گیا، رضائی منگوائی اور کہنے لگا: "معلوم ہوتا ہے مجھے بخار آئے گا سارے جسم میں کپکپی ہو گئی ہے۔" زائدہ نے واپس جا کر گورنر کو مختار کی علالت کی خبر دی۔ گورنر نے یقین کیا اور مختار کی طرف سے غافل ہو گیا۔

مختار جب بغاوت کے انتظامات مکمل کر رہا تھا تو شیعوں کے چند مذہبی مکھیوں کو اس بات پر شک ہوا کہ وہ ابن الحنفیہ کی طرف سے مامور ہے وہ مذہبی قسم کے لوگوں کا ایک وفد لے کر ابن الحنفیہ کے پاس تحقیق حال کے لئے مکہ روانہ ہوئے۔ ابن الحنفیہ سے مل کر انھوں نے کہا: "مختار آپ کے مامور ہونے کے مدعی ہیں اور ان چار امور کی طرف دعوت دے رہے ہیں ۱۔ کتاب اللہ ۲۔ سنت نبی ۳۔ اہل بیت کے قتل کا بدلہ ۴۔ کمزوروں کی حمایت ہم نے ان کی بیعت تو کر لی لیکن مناسب سمجھا کہ آپ سے مل کر ان کی صداقت کی تحقیق کر لیں اگر آپ کا حکم ہو تو ان کی اطاعت کریں ورنہ ان کو چھوڑ دیں۔" ابن الحنفیہ نے جواب میں کہا: "خدا کی قسم میں چاہتا ہوں کہ جس کی مدد سے چاہے خدا دشمنوں سے ہمارا انتقام لے۔"[1] ان مبہم الفاظ سے وفد نے نتیجہ نکالا کہ مختار کو ابن الحنفیہ کی تائید حاصل ہے۔

[1] طبری ۶/۹۷

مولانا ابوالکلام آزاد کا سفرِ عراق

افسانہ ہے یا حقیقت؟

(جناب مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی)

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد میں اختلاف ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں کیونکہ علامہ ذہبی کے بقول علماء کے لئے سب سے بڑا فتنہ معاصرت ہے اس کے اسباب پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن اس اختلاف کا اظہار کسی خاص نجی مجلس میں اشارہ کنائے میں بالفرض محال تصریح کے ساتھ بھی ہوا ہو تو ممکن ہے کہ ہوا ہو۔ مگر قلم کی زبان اور عوام کی نظر ایسی اختلاف نما تحریر سے نا آشنا تھی۔ مولانا آزاد کی طرف سے تو حسب معمول سکوت تھا اور ہے۔ لیکن سید صاحب ضبط پر قادر نہ ہو سکے۔ کچھ عرصے سے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ موصوف کے دل میں کچھ ہے۔ جسے کہہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر پھر خدا جانے کیوں کہتے کہتے رک جاتے ہیں۔ اور پُر معنی انداز سے مسکرا کر نکل جاتے ہیں۔

اوّل اوّل اس کا احساس ہمیں اس وقت ہوا۔ جب مولانا آزاد ۱۹۴۵ء میں قلعہ احمد نگر کی ڈھائی سالہ قید اور نظربندی سے آزاد ہوئے اور کچھ عرصہ بعد ان کے مکاتیب کا ایک مجموعہ "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (اب مرحوم) کے نام جیل کی تنہائی میں عالمِ خیال میں لکھے گئے۔ وہی "عالمِ خیال" جس کو مخاطب کرکے شوق قدوائی مرحوم نے کہا ہے ؎

اے مرے خیال تو کل کہاں کہاں گیا   میں بھی ترے ساتھ تھا تو جہاں جہاں گیا

اور رہائی کے بعد مطبوعہ صورت میں مولانا شروانی مرحوم کی خدمت میں ارسال کئے گئے۔ اس کتاب پر

ریویو کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اپنے تعلقِ خاطر کو "معارف" اعظم گڈھ جون ۱۹۴۶ء کے شذرات کے تیسرے پیرے میں یوں ظاہر کیا ہے کہ

"مخاطب تنہا "صدیق مکرم" حبیب الرحمن خاں شروانی ہیں۔ جن کے ساتھ ان کے چہل سالہ تعلقاتِ محبت ہیں۔ لیکن بعض ان کے ایسے "صدیق" عزیز بھی زندہ ہیں۔ جن کو گو دوستی کا دعویٰ نہیں مگر نیازمندی کا تو بہرحال ہے اور جس کی مدت اس چالیس سال کے تعلق سے بھی زیادہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لسان الغیب حافظ نے اس واقعہ کی پیشین گوئی صدیوں پہلے اپنے اس شعر میں فرمادی تھی

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را"

اور انہی سطور کے معارف شذرات کا جو خلاصہ یہ ہے کہ:

مولانا نے اپنے خطوں کے مجموعہ کا نام غبارِ خاطر رکھا ہے اس میں گل و بلبل اور بادہ و تریاک کی حکایتوں کے پردے میں دراصل انہوں نے اپنے سوانح کے بعض گمشدہ اوراق بطور خاص لکھے ہیں اور بعض ایسے حالات سپردِ قلم کئے ہیں جو اپنی نصف صدی کی قلمی زندگی کے عرصہ میں پہلی دفعہ انہوں نے ظاہر فرمائے ہیں مثلاً ایران اور عراق کے سفر کے بعض مشاہدات ضرورت تھی کہ وہ حضرت ان حضرات نے مشتاق اور قارئین سے بھی ظاہر فرما دئے تاکہ ان کے سوانح نگار ان کی سوانح عمری کے جو لکھے ہیں ان کو مناسب جگہ پر رکھ سکتے۔ (معارف اعظم گڈھ مئی جلد ۵ (ص ۴۰۰)

ان سفروں کا سال اور مدتِ سفر کا دریافت کرنا دو سبب سے ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کے سوانح نگار کی آئندہ مشکل دور ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ خود مولانا ندوی کو شک تھا کہ آیا یہ سفرِ عراق واقعہ ہے یا افسانہ۔ ہم نے جس وقت یہ ریویو پڑھا تو سچ یہ ہے کہ ہمیں تو یہی خیال آیا تھا کہ غالباً حضرت سید صاحب مولانا آزاد کے بیان کو کسی شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر اپنے شبہ کو تو بصورت الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے پردے میں مستور کرکے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات رفت گذشت ہوئی۔

آخر وہ وقت بھی آیا جو ہم سب کو پیش آتا ہے، یعنی صاحب غبارِ خاطر کے "صدیق مکرم" مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کا اگست ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کے جاننے پہچاننے والوں کو بقدر تعلق خاطر صدمہ ہوا

خود مولانا ابوالکلام آزاد کے دل پر کیا گذری اسی کا جاننا مشکل ہے، لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے جذبات حزن وملال کا اظہار معارف اعظم گڈھ دسمبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں کر دیا جو مولانا شروانی مرحوم ہی کے تذکرۂ جمیل پر مشتمل ہے۔ حضرت سید صاحب اپنے مقالہ "آہ! مولانا شروانی" کی ابتدا ان لفظوں سے کرتے ہیں کہ:—

"اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا۔ خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا۔ اور اپنی دوری مہجوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا۔ میں نے مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین میں رکھ لئے تھے اب جب مرحوم کا سانحہ پیش آیا تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی (معارف نمبر ۶ جلد ۶۶ صفحہ ۴۰۳)

حضرت سید صاحب کے اسی مضمون میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ اس عنوان سے آیا ہے کہ جس سے جون ۱۹۴۶ء کے معارف کی پردہ دارانہ نکتہ چینی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ علامہ سید سلیمان کا ارشاد ہے کہ مولانا شروانی مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے۔ عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا۔ ان کے قویٰ میں سب سے پہلے ان کے حافظہ نے جواب دیا۔ اکثر باتیں بھول جاتے تھے۔ جب کاروان خیال لکھا تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں ان کا یہ بیان پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ "ہاں مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفر عراق کو نکلے تھے۔ تفصیلات اب معلوم ہوئیں" میں نے انہیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر شاید (۱۹۰۸ء میں) دو نوجوان سفر عراق کو نکلے تھے جن میں سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے مگر دوسرے ابوالکلام نہیں۔ بلکہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری تھے۔ اور اس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے۔ بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق میں انتقال کیا ہندوستان خبر آئی۔ تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن وغم کا اظہار فرمایا۔ اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کے اس طرح تصدیق کرنے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی۔

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی۔ اور کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے اس کے جواب سے اعراض کرتے۔ اسی سے ان کے ادا شناس ان کے مطلب کو سمجھ جاتے۔" (معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۶۳ تا ۴۶۴)

اوپر کی عبارت سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:۔

۱۔ مولانا شروانی سیاست سے الگ رہتے تھے۔

۲۔ ان کو ملک اور خانگی حالات نے غمگین کر دیا تھا۔ مگر وہ خاموش رہتے تھے۔

۳۔ عمر اور افکار کی زیادتی کی وجہ سے ان کے حافظہ نے جواب دے دیا تھا۔ اس لئے واقعات بھول جاتے تھے۔

۴۔ مولانا ابوالکلام نے اپنے مندرجہ کاروانِ خیال خط میں اپنے سفرِ عراق کا جو ذکر کیا ہے وہ افسانہ ہے واقعہ نہیں۔

۵۔ لیکن مولانا شروانی نے کاروانِ خیال میں اس افسانہ کی تصدیق کر کے اسے تاریخ بنا دیا۔

۶۔ چونکہ مولانا شروانی بحث نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لئے حضرت سید صاحب کے توجہ دلانے پر بھی انھوں نے سکوت فرمایا۔

۷۔ مولانا سید سلیمان نے جو کہ ان کے ادا شناس تھے سمجھ لیا کہ مولانا شروانی گو اپنی غلطی مان گئے ہیں مگر حسب عادت خاموش ہیں اور بات درست وہی ہے جو قبلہ سید صاحب فرماتے ہیں

۸۔ بقول سید صاحب شروانی صاحب کہتے ہیں کہ سفرِ عراق پر جو دو نوجوان نکلے تھے ان میں سے ایک کا نام غلام محی الدین تھا اور دوسرے کا نام ابوالکلام

۹۔ حضرت سید صاحب کے نزدیک مولانا آزاد کے بڑے بھائی کا نام غلام محی الدین تھا اور وہ عراق میں فوت ہو گئے تھے۔

۱۰۔ غلام محی الدین کا دوسرا ہم سفر مولانا ابوالکلام نہ تھے بلکہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری تھے وغیرہ

اب آیئے! تنقیحات مندرجہ بالا کی روشنی میں "کاروانِ خیال" کی ورق گردانی کر کے اصل اللہ

میں علامہ سید سلیمان کی عبارت منقولہ کی حقیقت تلاش کریں۔ مگر پیشتر اس کے کہ "کاروانِ خیال" کو دیکھا جائے یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "کاروانِ خیال" مولانا شروانی اور مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد آپس میں ایک دوسرے کو لکھے گئے۔ اور انھیں مولوی عبدالشاہد خاں شروانی مقیم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے "غبارِ خاطر" کی اشاعت کے بعد ۱۹۴۶ء میں مرتب کیا اور مدینہ پریس بجنور میں چھپوا کر اسی سال شائع کیا اس وقت اسی کاروانِ خیال کی وہی پہلی اشاعت میرے سامنے ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء میں جو "کاروانِ خیال" طبع اول کے صفحہ ۶۰ سے شروع ہو کر ۶۵ پر تمام ہوا ہے اپنے دلربا اور مخصوص انداز میں اپنے ۳۲ برس پہلے کے سفرِ عراق کا ذکر فرمایا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اسی مکتوب کا متعلقہ حصہ یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ مولانا آزاد کی خلوص پسند اور جویائی خلوص طبیعت کا رنگ اور سفرِ عراق کی داستان سمجھنے میں آسانی ہو۔ مولانا آزاد ابتدائی گفتگو کے بعد مولانا شروانی سے خطاب کرتے ہیں کہ:-

آپ نے ایک بات خوب لکھی ہے۔ خلوص سدا بہار ہے۔ اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ کیا کہوں اس جملہ نے دل پر کیا اثر کیا اس کلمۂ حق کی شرح میرے دلِ درد مند سے پوچھئے۔ اکاون برس کی عمر ہو چکی۔ چند ماہ بعد باون برس پورے ہو جائیں گے گویا انگریزی محاورے میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس کے "رانگ سائڈ" میں پوری طرح آ چکا۔ عام طور پر لوگوں کی ہوش و آگہی کا زمانہ بیس بائیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مبدءِ فیاض کی بخششِ خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلے سے گذار دیا تھا۔ اس طرح گویا ایک کم چالیس برس ہوش و آگہی کے گذر چکے۔ اس چالیس برس کے اندر کارفرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں۔ صورت و معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہوگا۔ جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلوتہی کی ہو۔ اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہوگی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو۔ لیکن اگر آپ

۱؎ خط کشیدہ الفاظ مولانا شروانی کے ہیں جو ان کے مکتوب مشمولہ "کاروانِ خیال" طبع اول کے صفحہ ۶ پر موجود ہیں۔ شہاب

پوچھیں کہ مدۃ العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا کام آیا؟ تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیئے۔ دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں۔ ہاں اگر عیش حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں۔ زندگی کا حاصل اور عیشِ دنیا کا سرمایہ ہے ؎

ہر آنکہ خاطر مجموع و یارِ ہمنشیں دارد سعادت ہمدم او گشت و دولت ہم قریں دارد

کبھی شب میں چند لمحے فرصت کے میسر آجاتے ہیں تو ریڈیو میں طہران کی مجلس ساز کے چند آہنگ سن لیتا ہوں کہ کامل معنی میں سرد و ہمسایہ کے حکم میں داخل ہیں کل رات کو نو بجے طبیعت بہت بے کیف ہو رہی تھی۔ کاغذات کے انبار کو اپنی طبیعت کی طرح پریشان چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ریڈیو کو چھیڑا تو احمد تبریزی لسان الغیب کی یہ غزل اپنے آہنگ تازہ میں گا رہا تھا:

ز دلبرم کہ رساند نوازشِ قلمی کجاست پیکِ صبا گو بیا بکن کرمی

حدیث چون و چرا دردِ سر دہد ساقی پیالہ گیر! بیاسا ز عمر خویش دمی

بیا! کہ وقت شناسان دو کون بفروشند بہ یک پیالۂ صافی و صحبتِ صنمی

وقت کے تصادفات کا کرشمہ دیکھئے بعینہ یہ غزل آج سے بتیس برس پہلے ایک بزم انس میں سنی تھی اور کہاں سنی تھی؟ بغداد کی شب ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر۔

عُیُونُ المَهیٰ بَیْنَ الرُّصَافَةِ وَالجِسْرِ!

مرزا محمد کاظم رشتی نے کہ اعیان بوشہر میں سے تھے اور زیور فضل و دانش سے مجلی اپنی کشتی میں یہ مجلس ترتیب دی تھی۔ ایک تازہ وارد مغنی نے کہ مشہدی کے نام سے مشہور تھا عود پر اپنا کمال دکھایا تھا۔ کیا عرض کروں دل پر کیا گذری۔ حافظ کی یہ غزل حسب حال اشعار اور بتیس برس پہلے کی بچھڑی ہوئی دنیا کا تصور ایک عجیب عالم طاری ہو گیا۔ عراق کی گذری صحبتیں ایک ایک